بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مشہور مؤرخ پروفیسر ٹائن بی کے نظریہ "چیلنج اور اس کے جواب" کی علمی حیثیت کیا ہے، اِس سے ہمیں اس وقت کوئی بحث نہیں، لیکن اس کی ایک افادیت بہرحال اپنی جگہ مسلّم ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح زلزلے کے اثرات سے کسی عمارت کی پختگی کا اندازہ لگایا جاتا ہے بالکل اسی طرح مصائب اور اُن سے نبرد آزما ہونے کے عزم ہی سے کسی قوم کی خفتہ قوتوں اور اس کی چھپی ہُوئی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پھر جس طرح عمارت کے استحکام کا اندازہ ہم اس کے در و بام اس کی آرائش و زیبائش سے نہیں لگاتے بلکہ اُس محکم بنیاد کو نگاہ میں رکھتے ہیں جس نے اسے زلزلے کے شدید جھٹکوں سے بچایا، بالکل اسی طرح ہم قوموں کے حفظ و بقا میں بھی یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے ہاں کتنے سینما ہال ہیں، کتنی رقص گاہیں ہیں، اور ان میں کتنی رونق ہوتی ہے، اور میخانے کس قدر آباد ہیں، بلکہ اُس غیر مرئی طاقت اور قوت کا کھوج لگایا جاتا ہے جس کے سہارے پر یہ قوم بڑی پامردی کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرتی ہے۔ یہ جائزہ بڑا دلچسپ ہے اور اس سے تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں بعض نہایت مفید ابواب کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

اس وقت ہمیں دوسری قوموں سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں ہم پاکستان کی اس اصل قوت کا ماخذ و منبع معلوم کرنا چاہتے ہیں جس کے بل پر اس نے حالیہ جنگ کے زلزلے کا مقابلہ بڑی مضبوطی کے ساتھ کیا ہے۔

بھارت نے جن حالات میں ہم پر حملہ کیا ہے اُن میں مادی اعتبار سے ہم جس قدر مضبوط

ہیں اس کا اندازہ ہم سب کو ہے۔ ہم پر اچانک ایک ایسی قوم ٹوٹ پڑی جو تعداد، اسلحہ اور دیگر ساز و سامان کے لحاظ سے ہم سے کم از کم پانچ گنی زیادہ طاقتور تھی۔ تعداد میں زیادتی اور وسائل کی فراوانی کی وجہ سے دنیا کی تمام بڑی قومیں، امریکہ، روس اور برطانیہ اس کی ہر طرح پشت پناہی کر رہی تھیں۔ ایک فعّال سیاسی جماعت نے جس کی بہرحال اپنی ایک تاریخ ہے۔ اسے رہنماؤں کی ایک بڑی تعداد مہیا کر رکھی ہے۔ سائنس، فلسفہ، ادب، معیشت اور معاشرت، غرض ہر شعبۂ زندگی میں ہندوستان کے پاس نہایت اچھے دماغ موجود ہیں۔ الغرض جہاں تک بھارتی قوم کے اعضاء کا تعلق ہے انہیں کسی صورت بھی کمزور نہیں کہا جا سکتا۔

اگر ان سب پہلوؤں کو نگاہ میں رکھ کر اہلِ پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو حالت کچھ زیادہ تسلی بخش نظر نہیں آتی۔ ہمارے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے۔ ہمارا نہ رقبہ یک جا ہے نہ آبادی مجتمع۔ پھر اس ملک کے مختلف خطوں کے رہنے والوں میں نہ تو رنگ کا اشتراک ہے، نہ نسل اور زبان کا۔ ہم گزشتہ ۱۸ برس سے مسلسل اخلاقی انحطاط کا شکار ہو رہے تھے اور اب تو حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ہماری آبادیوں میں جرائم کی کثرت کے باعث کوئی شخص اپنی جان و مال اور آبرو کو بھی محفوظ نہ پاتا تھا۔ آرٹ اور کلچر کے نام سے یہاں فحاشی کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ سیاسی گروہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے اور مذہبی طبقوں کی باہمی رقابتوں نے مذہب کا وقار گرا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں اہلِ علم، اہلِ فکر اور اہلِ فن کی بھی اتنی نمایاں تعداد نہ پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ہماری قوم دنیا میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے اندر کوئی ایسی معتمد اور جامع صفات شخصیت بھی نہ تھی جس کی آواز صورِ اسرافیل کی حیثیت رکھتی اور پوری قوم خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاتی۔ ایثار، باہمی ہمدردی، جذبۂ تعاون یہ صفات آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھیں اور ان کی جگہ چالاکی، عیّاری، خود غرضی کا تسلط قائم ہو رہا تھا۔

یہ سارے حالات کسی قوم کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے والے نہ تھے بلکہ اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے والے تھے۔ چنانچہ ہماری قوم پر بڑی سرعت سے اضمحلال طاری ہو رہا تھا کہ یکایک بھارت کا حملہ ہونے کے ساتھ ہی اُس کے اندر زندگی کی بالکل ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ افتراق کی جگہ اتحاد پیدا ہوا۔ مختلف طبقوں کی منافرت چشم زدن میں ختم ہو گئی۔ ہر گروہ نے دوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ خود غرضی کی جگہ ہر مقام پر ایثار اور ہمدردی کے نمونے نظر آنے لگے۔ عافیت کوشی اور سہل انگاری کی بجائے مردانگی، عزم اور جفاکشی کی صفات اُبھر کر سامنے آگئیں۔ آبرو باختہ اور بدکردار لوگوں نے اپنی سابقہ روش بدل کر عوام کی عزت و آبرو کی حفاظت شروع کر دی اور جرائم سے ہاتھ روک لیے۔ اور تاجروں نے جن کی خودغرضانہ ذہنیت نے محنت کشوں اور عام آبادی کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا یکایک اپنے رویّہ میں تبدیلی پیدا کی اور اس موقع کو ناجائز منافعوں کے حصول کا ذریعہ بنانے کی بجائے اس میں غیر معمولی ایثار کا ثبوت دیا۔ فوج کے ایک ایک فرد نے جس عالی ہمتی، جس بے مثال شجاعت، جس صبر و ثبات، جس ضبط و نظم اور جس بلند کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس کی نظیر دورِ جدید میں ملنی بہت مشکل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ایک نیم برّاعظم کے رہنے والے، جنہیں ایک دوسرے سے الگ ہوئے بمشکل اٹھارہ سال ہوئے ہیں اُن کے درمیان فکر و نظر اور جذبہ و احساس کا یہ عظیم اختلاف کیوں رونما ہوا۔ اگر محض جنگ نے مسلم قوم کے اندر یہ خصوصیات پیدا کی ہیں تو پھر بھارت کے رہنے والوں کو بھی اسی طرزِ عمل کا ثبوت دینا چاہیے تھا۔ مگر واقعات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تعمیری صلاحیتیں اُبھرنے کی بجائے منفی رجحانات نے زور پکڑنا شروع کیا۔ اگر محض جنگ ہی قوم کی تعمیر کر سکتی تو آج تک دنیا کی کوئی قوم بھی برباد نہ ہونے پاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جنگ ایک آزمائش یا چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس بنا پر یہ قوم کی دبی ہوئی اور خفتہ قوتوں کو بیدار کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہے مگر کسی تعمیری قوت کو از خود جنم نہیں دے

سکتی۔ جنگ کی آگ میں جھونکے جانے کے بعد وہی قومیں کندن بنتی ہیں جن میں صلاحیت پہلے سے موجود ہو۔ ورنہ تعمیری قوتوں سے محروم اقوام کو تو جنگ بالکل برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔

پھر ان قوتوں کے متعلق بھی یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ اُسی صورت میں اُبھر کر سامنے آتی ہیں جب کوئی زبردست محرک ان کے اندر تحریک پیدا کرے۔ اخبارات میں بھارتی فوج کے بارے میں اسی کے ایک میجر جنرل نرنجن پرشاد کے جو تاثرات مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں وہ اس حقیقت پر پوری طرح شاہد ہیں کہ اُس کی بزدلی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ اُس کے سامنے کوئی ایسا واضح نصب العین نہ تھا جس کا عشق اُسے جان کی بازی لگا دینے پر آمادہ کرتا۔ کرائے کے سپاہی پیٹ کے لالچ میں پاکستان کے مقابلے میں اُتر آئے تھے لیکن وہ حیران و ششدر تھے کہ آخر زندگی جیسی قیمتی متاع کو وہ کسی بلند و بالا مقصد کے حصول کے لیے نچھاور کریں۔ محض دشمن پر فتح حاصل کرنا تو کوئی بلند نصب العین نہیں۔ یہ تو ایک منفی ہیجان ہے جس سے مغلوب ہو کر غیر مہذب لوگ کمزوروں پر پل پڑتے ہیں لیکن ہر ہیجان کی طرح یہ کسی فرد یا قوم کو زیادہ دیر تک ایک روش پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ یہی حال بھارت کا ہے۔ اُس نے بغیر کسی مقصد اور نصب العین کے محض اپنی قوت و طاقت کی نمائش اور پاکستان کو مرعوب کرنے کی غرض سے اس خطۂ پاک پر یلغار کی لیکن جب آگے سے اہلِ پاکستان نے مزاحمت کی تو نشہ فوراً ہی ہرن ہو گیا۔ اور مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ جب تک کسی واضح نصب العین کی روشنی کسی قوم کی راہ کو منور نہ کرے اس وقت تک اس قوم کیلئے کسی ایک روش پر مصائب اور آلام میں گھرے رہنے کے باوجود لمبی مدت تک قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے اس حقیقت کا صرف نرنجن پرشاد نے ہی اعتراف نہیں کیا بلکہ دنیا کے بڑے بڑے غیر مسلم اخبارات نے بھی اس صداقت کو تسلیم کیا ہے۔ لندن آبزرور کی جو رپورٹ سامنے آئی ہے اُس میں اس حقیقت کی طرف بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ "پاکستانی فوج کی کامیابی کا سب سے بڑا اور اصل راز اس کا واضح نصب العین ہے۔"

پاکستان کی افواج اور اس کے باشندوں نے اس خطۂ ارضی کی حفاظت میں جس فدائیت اور ایثار کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر کبھی ایک لمحہ کے لیے باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں دنیاوی غرض کا کوئی شائبہ بھی موجود تھا۔ اس ملک کے ایک ایک فرد نے جس بے لوث کردار کا مظاہرہ کیا ہے وہ اس حقیقت کا پوری طرح آئینہ دار ہے کہ اس کی تہ میں کوئی بڑا پاکیزہ اور مقدس جذبہ کام کر رہا ہے اور کسی بڑے ہی اعلیٰ و ارفع مقصد کی غیر معمولی محبت نے ہمارے اندر عزم و استقلال اور پاکیزہ احساسات پیدا کیے۔ یہ مقصد بجز اسلام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت آج پوری طرح نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ مسلمانوں کی قوت کا اتھاہ اور لازوال خزانہ صرف اسلام ہی ہے۔ دوسرے ممالک کو تو فی الحال نظر انداز کیجیے۔ اس ملک میں مسلمانوں نے جب کبھی کوئی جد و جہد کی تو اس کا محرک صرف اسلام تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے مجدد الف ثانی نے قلعہ گوالیار میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ اسی کی سربلندی کے لیے بالاکوٹ میں غدی اور سعید روحوں نے جانیں دیں۔ یہی نصب العین مختلف اوقات میں مختلف تحریکات کی صورت میں نمودار ہوا۔ تحریک خلافت، تحریکِ دیوبند، تحریکِ ندوہ اور خود تحریکِ پاکستان اسی بنیادی مقصد یعنی احیائے اسلام کے مختلف مظاہر ہیں۔ اور اب بھارت کے حملے کا اہلِ پاکستان نے جس پامردی اور جن نیک اور پاکیزہ عزائم کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، وہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس قوم کو اگر کوئی چیز دنیا میں عزت و احترام کے ساتھ زندہ رکھ سکتی ہے تو محض اسلام ہے۔ اس کے علاوہ جتنے دوسرے سہارے ہیں ان کی حیثیت پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش میں ہم پر جو احسانات کیے ہیں وہ شمار سے باہر ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس خطہ کو اسلام کے احیاء کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ دنیا ہم پر تنگ ہو گئی تھی۔ باری تعالیٰ نے ہمیں وسعت و کشائش کی راہ دکھائی۔ ہم دشمن کے مقابلے میں کمزور اور ناتواں تھے۔ اس نے ہمیں اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے قوت و توانائی بخشی۔

ہم جن قوموں پر تکیہ لگا کر خداوند تعالیٰ کی تائید و نصرت سے غافل ہو رہے تھے انہوں نے عین وقت پر ہمیں دھوکا دیا اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگا کہ ہم دنیا میں بالکل تنہا اور بے سہارا ہو کر رہ گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت میں ہماری معاونت اور دستگیری فرمائی جنگ کے بعض واقعات کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس مالک الملک نے فرشتوں کو ہماری مدد کے لیے بھیجا۔ اگر ہم امریکہ، برطانیہ اور روس کی تائید سے محروم ہو گئے تھے تو ہماری حمایت پر بعض دوسری قوموں کو کھڑا کر دیا۔ دنیا کے سارے مسلم ممالک میں اخوتِ اسلامی کے جذبہ کو اُبھارا اور وہاں کے عوام اور خواص نے نہ صرف ہمارے موقف کی اخلاقی تائید کی بلکہ پُورے جوش اور ولولے کے ساتھ ہماری طرف دستِ تعاون بڑھایا اور ہمارے دوش بدوش کھڑے ہو کر کفر کی یلغار روکنے کے لیے پیش کش کی۔

دنیا میں ہم سے زیادہ بدبخت اور بدنصیب کون ہوگا اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ان نوازشات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اس سے مُنہ موڑنے کی حماقت کریں۔ یہ وقت باری تعالیٰ کی نافرمانی کا نہیں بلکہ اُس کی احسانمندی اور شکر گزاری کا ہے۔

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جانور میں تھوڑا سا چارہ ملنے پر بھی ترو تازگی پُوری ہو، اور دُودھ زیادہ دے۔ اسی سے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پُوری قدر کرے۔ باری تعالیٰ نے واقعی ہماری حقیر کوششوں کو شرف پذیرائی بخشا۔ اس بنا پر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم اُس کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اُس کے ساتھ مضبوط رشتۂ عبودیت استوار کریں۔ کیونکہ ہم اُس کی شکر گزاری میں جتنا آگے بڑھیں گے اتنا ہی وہ ہم پر انعام و اکرام کی مزید بارش فرمائے گا۔

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ	اگر شکر گزار ہو گے تو میں تم کو اور زیادہ دونگا

وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ	اور اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا

(ابراہیم - آیت ۷) بہت سخت ہے ۔

قرآن مجید میں مختلف اقوام کے جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو پہلی مرتبہ سرکشی کرنے پر ہی اپنی گرفت میں نہیں لے لیا بلکہ اس کی رحمت نے دنیا کی ہر قوم کو بار بار سنبھلنے کا موقع دیا کہ وہ نافرمانی کی روش چھوڑ کر حق وصداقت کی راہ اختیار کرے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا کی۔ اُن کی رہنمائی کے لیے بڑے جلیل القدر انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ انہیں دنیاوی ذرائع و وسائل سے مالامال کیا اور دُنیا میں اُن کے آرام کے لیے مختلف سامان مہیا کیے۔ پھر انہیں اقوام عالم میں عزت وبرتری دی لیکن بدعہدی اس قوم کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ جب مصائب کا ریلا آتا، یہ قوم کانپ اٹھتی۔ اللہ کی طرف رجوع کرتی اور اس کے ساتھ اطاعت وفرمانبرداری کا عہد وپیمان باندھتی۔ لیکن مصائب کے چنگل سے رہا ہوتے ہی سب کچھ بھلا دیتی اور بغاوت اور سرکشی کی اُسی راہ پر گامزن ہو جاتی جس پر مصائب کے آمڈنے سے پہلے چل رہی تھی۔

بنی اسرائیل مصر کے جابر اور ظالم فرمانرواؤں کے تحت جس طرح ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ باری تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اُن کی نجات کا سامان پیدا کیا۔ مگر اس قوم نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور ہر قدم پر بُری ناپسندیدہ روش اختیار کی۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں عطا کیں لیکن انہیں دیکھنے کے باوجود بہت کم لوگ ایمان لائے۔ پھر مالک الملک نے عین اُن کی آنکھوں کے سامنے فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینے والے گروہ کو معجزانہ طور پر بحرِ قلزم پار کرا دیا۔ لیکن اس قوم کی ذہنی کجی کا یہ عالم تھا کہ بیابان شور سے گزرتے ہوئے جب اس نے سینا کے بُت کدوں میں پرستارانِ صنم کو بتوں کی پُوجا میں مشغول دیکھا تو کہنے لگی "موسیٰ! ہم کو بھی ایسے ہی معبود بنا دے تاکہ ہم بھی اسی طرح اُن کی پرستش کریں"۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

قوم کی زبان سے جب یہ مشرکانہ مطالبہ سُنا تو بہت رنجیدہ ہوئے اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "بدبختو! خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر بتوں کی پرستش پر مائل ہو اور خدا کی اُن تمام نعمتوں کو فراموش کر بیٹھے ہو جن کا مشاہدہ تم اپنی آنکھوں سے کر چکے ہو۔"

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (صف آیت ۵)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا! اے قوم تو کس لیے مجھے ایذا پہنچاتی ہے جبکہ تجھے معلوم ہے کہ میں تیری جانب اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ پھر جب وہ کجی پر اڑے رہے تو اللہ نے بھی ان کے دلوں پر کجی کو مسلط کر دیا اور اللہ نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔

اللہ کی نشانیوں کو دیکھنے کے بعد راہِ حق سے انحراف کرنا بہت بڑی ضلالت اور گمراہی ہے اور مصیبت کے ٹل جانے کے بعد اُس سے مُنہ پھیر لینا پرلے درجے کی احسان فراموشی اور ناشکری ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک قسم کے نفسیاتی مرض کی علامات ہیں۔ اس مرض میں مبتلا ہونے والا حقیقت پسند نہیں بلکہ حقیقت ناشناس ہوتا ہے۔ وہ واضح اور روشن دلائل کو قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے۔ اُس کے دل و دماغ میں نخوت اور تکبر کے جراثیم ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنے اندر کسی نیکی کو راہ پانے کا موقع نہیں دے سکتا۔ اس کا مغرورانہ احساس اُس کے جذبہ سپاس گزاری کو مضمحل کر دیتا ہے اور وہ اس حد تک بے حس اور غافل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کا بھی اعتراف نہیں کر سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب باری تعالیٰ نے ہر شعبۂ زندگی کے متعلق واضح احکام تختیوں پر لکھ کر دے دیئے تو پھر اُن سے کہا:

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۔ سَاَصْرِفُ — عنقریب میں تمہیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔

عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِھَا۔ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوْا عَنْھَا غٰفِلِیْنَ۔

(الاعراف۔ آیات ۱۴۵-۱۴۶)

مَیں اپنی نشانیوں سے اُن لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔ وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور اس سے غفلت برتتے رہے۔

اللہ کا عذاب صرف بنی اسرائیل پر ہی نازل نہ ہُوا بلکہ دنیا کی ہر وہ قوم اس کی گرفت میں آئی جس نے مالک الملک کی دی ہوئی مہلتوں سے اپنے غرورِ نفس کی بنا پر فائدہ نہ اٹھایا۔ قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور اسی طرح کی دوسری بے شمار قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں میں ہمیں بھی ایک سبق ملتا ہے کہ انہیں صفحۂ ہستی سے اس بنا پر مٹا دیا گیا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بار بار بدعہدی کا ارتکاب کیا۔ جب مصیبت آئی تو اس کے حضور میں گڑگڑانے لگے اور عذاب سے نجات دلانے کی التجائیں کرنے لگے۔ لیکن عذاب ٹلتے ہی اُسی روش پر گامزن ہو گئے جو فساق، فجار اور ایمان سے عاری لوگوں کی روش ہوتی ہے۔ نقضِ عہد معاشرتی نقطۂ نظر سے بھی ایک سنگین بُرائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں کسی شخص پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جائے۔ لیکن جب خدا کا بندہ اپنے خالق و مالک ہی سے بدعہدی کرنے لگے تو اس سے بڑے جرم کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک شرمناک مذاق ہے کہ بار بار اُس سے وعدہ کرے اور اس کی بے مثال فیاضی، تحمّل اور بُردباری اور اس کی

بے پایاں رحمت سے فائدہ اٹھا کر پھر اس سے منہ موڑے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا تذکرہ کرتے ہوئے ہی قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ بدنصیب قوم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس لیے محروم ہو گئی کہ اسے اپنے عہد کا کوئی پاس نہ تھا۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً۔ (المائدہ - ۱۳)

پھر یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیئے۔

پاس عہد کی صحیح صورت ایک ہی ہے کہ عبودیت کے اُن تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے جو ایک بندے پر اس کے مالک کی طرف سے عائد ہوتے ہیں اور یہ فرض اکراہ اور بددلی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری خوشدلی اور جذبۂ سپاس گزاری کے ساتھ ادا کیا جائے۔ عبودیت اور شکر گزاری دونوں لازم ملزوم ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا صحیح معنوں میں بندہ ہو وہ کبھی ناشکر گزار نہیں ہو سکتا۔ وہ ہر مرحلہ پر اپنے خالق و مالک کی طرف رجوع کرے گا۔ ہر مصیبت میں اسی سے اعانت کا طلبگار ہو گا اور باری تعالیٰ جب اُسے اپنی رحمت سے نوازے گا تو پھر وہ اُس سے غافل ہونے کی بجائے اُس کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرے گا۔ مالک الملک کی احسان فراموشی کا تو کوئی مسلمان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو کافروں اور خدا کے باغیوں کا شیوہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کی طرف مختلف انداز میں تصریح کی گئی ہے۔

وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِن تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ۔ (الزمر - ۷)

اللہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا ہے اور وہ تمہاری شکر گزاری کی روش کو تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

إِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ ضُرٌّ دَعَا

جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ

رَبَّهٗ مُنِیۡبًا اِلَیۡهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعۡمَةً مِّنۡهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدۡعُوۡۤا اِلَیۡهِ مِنۡ قَبۡلُ وَ جَعَلَ لِلّٰهِ اَنۡدَادًا لِّیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِهٖ ؕ قُلۡ تَمَتَّعۡ بِكُفۡرِكَ قَلِیۡلًا ۖ اِنَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۔ (الزمر - ۸)

اپنے رب کی طرف متوجہ ہو کر اسے پکارتا ہے۔ پھر جب اللہ اُس کو نعمت سے نوازتا ہے تو وہ اس مصیبت کو بھول جاتا ہے جس سے بچانے کے لیے وہ پہلے اس کو پکار رہا تھا، اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانے لگتا ہے تاکہ اس کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دے۔ اے نبی، اس سے کہدو کہ اپنے کفر کا مزہ کچھ دن اور اٹھا لے۔ تو دوزخیوں میں سے ہونے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر اور ایمان میں نہایت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ یہ ایمان کی جڑ دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہوتی ہے اور اپنے خالق پر اُس کا ایمان مضبوط ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ شکر گزاری ایمان کی شہادت ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ قرآن مجید نے اس کی یوں صراحت فرمائی ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعۡبُدۡ وَ كُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِیۡنَ ۔ (الزمر - ۶۶)

بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ ہم پاکستان کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی اُن نعمتوں کا کس طرح شکر ادا کریں جو اس نے ہم پر ہماری ساری غفلتوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کے باوجود کی ہیں۔ شکر گزاری تین طریقوں ہی سے کی جا سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے، اور عمل سے۔ دل سے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم پوری یکسوئی کے ساتھ اُس کی طرف رجوع کریں، اُس کی رضا کو دنیا کی ہر چیز پر مقدم رکھیں، اُسی کو اپنا حقیقی منعم سمجھیں، اُسی کی ذات سے ہمیشہ ہر حال میں

بھروسہ کریں اور جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کا ارادہ نہ کریں۔ یہ کیفیت ہمارے اندر اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہمارے دل میں اللہ پر سچا اور پختہ ایمان موجود ہو۔ اور یہ ایمان دینی طرزِ فکر ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں سب سے پہلے ملک کے اندر اس طرزِ فکر کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے وہ اس طرزِ فکر کو تقویت پہنچانے کی بجائے اُسے مضمحل کرنے والا ہے۔ آج اگر لوگوں میں اس نظامِ تعلیم و تربیت سے "فیض یاب" ہونے کے باوجود ایمان کا نور باقی ہے تو یہ اس نظام کا عطیہ نہیں ہے بلکہ زیادہ تر یہ ہماری صدیوں کی قومی روایات کے غیر شعوری اثرات کا نتیجہ ہے، اور ایک اچھی خاصی تعداد ہمارے اندر ایسے لوگوں کی بھی موجود ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے فطرتِ ابراہیمی پر پیدا کیا ہے کہ باطل افکار و نظریات کی آگ میں پوری طرح جھونک دیئے جانے کے باوجود ان کے ایمان پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ ورنہ ہماری نوخیز نسلوں کو درسگاہوں میں جو سائنس اور فلسفہ پڑھایا جاتا ہے وہ تو اُن سارے معتقدات کی عین ضد ہے جو اُمت کا سرمایۂ حیات ہیں، جن کی بدولت اِس اُمت نے ہر مرحلہ پر مصائب اور مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے اور جن کے معجزانہ اثرات ہم اس جنگ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ آخر سوچیے کہ وہ کونسا سہارا تھا جس کے بل بوتے پر آج قوم کھڑی ہو گئی؟ وہ کونسا جذبہ تھا جس نے قوم کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑایا؟ وہ کونسا پارس تھا جس نے مسِ خام کو دفعتاً کندن بنا کر رکھ دیا؟ آپ اس سوال پر جتنا غور کریں گے ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارے اندر زندگی کی جو غیر معمولی حرکت پیدا ہوئی ہے، ہمارے دلوں میں جو مقدس ولولے بیدار ہوئے ہیں وہ سب انہی معتقدات کا فیضان ہے جن کا اس جدید تعلیم کے علی الرغم بچا کھچا سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ نظامِ تعلیم ہمارے دینی طرزِ فکر کو نشو و نما دینے کے بجائے محض مغربی قوموں کی بھونڈی نقالی میں صرف ہو رہی ہے، اور یہ نظامِ تربیت ہمیں اسلامی نصب العین سے قریب تر کرنے کے بجائے اُس سے بڑی سرعت کے ساتھ دُور لے جا رہا ہے۔ آج ہمارے فکر و عمل میں جو بگاڑ نظر آتا ہے وہ سب اسی غیر ملکی نظامِ تعلیم کا

نتیجہ ہے۔ یہ تو محض خداوند تعالیٰ کا فضل ہے کہ اُس نے اسلام کے لیے ان حوصلہ شکن حالات میں بھی ہمارے دل و دماغ سے اس کی برتری کا نقش قائم رکھا اور اس نعمتِ غیر مترقبہ سے ہمیں محروم نہیں فرمایا۔ ورنہ جس قسم کے فکری اور نظریاتی ماحول میں اور جس قسم کی اسلام کش فضا میں ہماری اولاد تعلیم حاصل کر رہی ہے، اس میں اسلام سے عقیدت اور وابستگی کا موجود ہونا کسی طرح بھی معجزہ سے کم نہیں۔

اس جنگ کے حالات کو دیکھ کر اگر کوئی بنیادی سبق ہم حاصل کر سکتے ہیں تو صرف ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم قوم کو ذہنی انتشار سے نجات دلائیں اور ان معتقدات کی پرورش کا سامان کریں جن پر اس قوم کے حفظ و بقا اور توسیع و ترقی کا سارا دار و مدار ہے۔ اس ضمن میں ہمیں سب سے زیادہ اپنے نظامِ تعلیم میں اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انگریزی کی برتری ختم کر کے اس کی جگہ اردو اور عربی کو رواج دیا جائے۔ نصاب کی اس طرح تدوین کی جائے کہ اُس میں خدا اور آخرت اور وحی کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونے کی بجائے اس کا یقین پیدا ہو۔ سائنس خالقِ کائنات کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرے۔ فلسفہ ذہن سے تشکیک کے سارے کانٹے چُن کر اُس میں اسلامی عقائد کی آبیاری کرے۔ علم المعیشت وہ اصول دے جن سے اسلامی احکام و ہدایات کے مطابق معاشرے میں ایک پاکیزہ معاشی نظام معرضِ وجود میں آئے۔ علمِ سیاست دین و دنیا کی ثنویت کے غیر اسلامی تصور کا ابطال کر کے دین کی اساس پر مملکت کے قیام میں امت کی رہنمائی کرے۔ علم الاخلاق مغرب کی اخلاقی اقدار کی برتری ثابت کرنے کے بجائے اسلام کی پیش کردہ اقدارِ حیات کا شارح و ترجمان ہو اور ان کی صحت پر واضح دلائل فراہم کرے۔ الغرض غیر اسلامی طرزِ فکر کی ترویج و اشاعت کی جگہ خالص خدا پرستانہ طرزِ فکر پروان چڑھے اور ہماری نئی نسلیں دینی افکار و نظریات کی علمبردار بن کر دنیا میں اپنا مقام پیدا کریں۔

طرزِ فکر یا عقائد کے بعد دوسری چیز جو ہماری توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے وہ اسلامی اخلاق ہے۔ یہ اسی اخلاق کا بچا کھچا سرمایہ تھا جو اِن پُرآشوب حالات میں ہمارے کام آیا۔ اگر ہمارے پاس یہ سرمایہ نہ ہوتا تو ہم کبھی بھی دشمن کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکتے۔ اسی اخلاق کی بدولت ہمارے تاجروں کے اندر لوٹ کھسوٹ کا ناپاک جذبہ پیدا ہونے کے بجائے ایثار اور ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانا ان کے لیے کچھ مشکل نہ تھا مگر انھوں نے محض جذبۂ جہاد کی بنا پر ایسا کرنا معیوب سمجھا اور ایک ایسی روش اختیار کی جس کا اسلامی اخلاق مقتضی تھا۔ اسی طرح اگر معاشرے کے ناپسندیدہ عناصر اپنی سابقہ روش پر قائم رہتے ہوئے اپنی سماج دشمن حرکات سے باز نہ آتے تو گھروں سے اجڑنے والی آبادیوں کا جو حشر ہوتا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کیا اور اس بنا پر یہ لوگ مظلوموں کو اپنی ستم رانیوں کا تختۂ مشق بنانے کے بجائے ان کی معاونت اور دستگیری کرنے پر کمربستہ ہوئے۔ اسی سلسلہ میں اس بات پر بھی غور کیجیے کہ اگر بھارت کا حملہ ہوتے ہی ہر شخص اپنی عافیت کی فکر میں لگ جاتا تو پھر دوسروں کی عافیت کی کیونکر فکر کرتا۔ اگر بزدلی کی وجہ سے قوم میں بھگدڑ مچ جاتی تو اس حالت میں ہمارے پاؤں کہاں جم سکتے تھے۔ آزمائش کے اس دَور میں اسلام نے جو ہمیں اخلاق دیئے تھے وہی آخرکار ہمارے کام آئے۔ ہماری افواج نے تعداد میں کم ہونے کے باوجود بڑی پامردی کا ثبوت دیا۔ ہماری آبادیوں نے زندگی اور موت، نفع اور نقصان خدا کے اختیار میں سمجھتے ہوئے غیر معمولی ہمت اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے تاجروں نے قومی مصالح کو منافع پر ترجیح دی اور خدا کی محبت پر دولت کی محبت کو قربان کر دیا یہاں تک کہ ہماری قوم کے بدنام لوگوں نے بھی محض خدا ترسی کی وجہ سے بُرائی سے ہاتھ روک لیے۔ ہم کو اس وقت یہ دیکھنا چاہیے کہ جس نظامِ اخلاق نے ان پُرآشوب حالات میں ہماری دستگیری کی ہے کیا ہم گزشتہ ۱۸ برس سے اُس کے استحکام کی فکر میں لگے ہوئے تھے یا اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں منہمک رہے۔ یہی بات

یہ ہے کہ ہم نے اسلامی اخلاق کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ۔ درسگاہوں میں ادب ، آرٹ اور کلچر کے نام پر اس کی بیخ کنی کی پوری کوششیں کی گئیں ۔ معاشرے میں ثقافت کے نام پر ہر اُس برائی کو پھیلایا گیا جو اس اخلاق میں انتہائی معیوب اور فتنہ انگیز تصور کی جاتی ہے مخلوط تعلیم کی وجہ سے مرد و زن کا اختلاط بڑھا اور اسلام نے حسن و نظر کے درمیان جو پردے حائل کر رکھے ہیں وہ چاک ہوئے ۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج سے خاندانی نظام کی بنیادیں تنزلزل کرنے کے سامان ہوئے ۔ خاندانی نظام کا دارو مدار میاں اور بیوی دونوں کی پاکبازی ، اولاد سے محبت اور خدا خوفی پر ہے ۔ مگر خاندانی منصوبہ بندی کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی ہے اُس کے پیہم تجربات سے دنیا بھر میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ جس جس قوم کے اندر بھی یہ مقبول ہوئی اس میں لوگوں نے خاندانی ذمہ داریوں سے بچ کر آزاد شہوت رانی کی غیر اخلاقی راہ اختیار کی ۔ یہ تجربات مختلف ممالک میں ماضی اور حال ہر عہد میں ہو چکے ہیں اور ان کا یہی نتیجہ ہر مقام اور ہر دور میں برآمد ہوا ہے ۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا ہم اخلاق کو مضبوط کر کے خاندانی نظام کو مستحکم بنانا چاہتے ہیں یا عوام کو سرکاری خرچ سے منع حمل اور اسقاطِ حمل کے گر سکھا کر انہیں عیاشی اور فحاشی کی راہ پر ڈالنے کے آرزو مند ہیں ؟

یہ وہ وقت ہے جس میں ہمیں اُن ساری بُرائیوں کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے جن سے ہمارے اخلاق بگڑنے کا ذرا سا بھی اندیشہ ہو ۔ اس معاملے میں معمولی غفلت بھی اپنی بربادی کو دعوت دینے کے مترادف ہے ۔ اس بنا پر یہ چیز اشد ضروری ہے کہ ثقافت کے نام پر جو کاروبار یہاں ہو رہا ہے اُسے فی الفور لپیٹ دیا جائے ۔ مخلوط تعلیم کا خاتمہ کیا جائے ۔ ریڈیو اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع کو قوم کے اخلاق بگاڑنے کے بجائے انہیں سنوارنے کے لیے پوری طرح استعمال کیا جائے ۔ سول سروس کے انتخاب میں قابلیت اور استعداد کو نگاہ میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اخلاق کو بھی نگاہ میں رکھا جائے اور جو اس معیار پر پُورے نہ اُترتے

(باقی صفحہ پر)